North Asian International Research Journal of Multidisciplinary

IRJIF IMPACT FACTOR:6.019

ISSN: 2454-2326 Vol. 8, Issue-9 September-2022

Index Copernicus Value: 58.12 Indian Citation Index Thomson Reuters ID: S-8304-2016

NAIRJC A Peer Reviewed Refereed Journal

کشمیر کے اردو افسانہ میں مزاحمتی شعور کی عکاسی ۱۹۴۷ سے ۱۹۹۰ء تک:

افشانہ قیوم

ریسرچ فیلو

شیخ العالم سینٹر فار ملٹی ڈسپلنری سٹڈیز

یونیورسٹی آف کشمیر

دنیا کے ہر ادب کی طرح کشمیر کے لوک ادب میں بھی مزاحمت کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ یہاں بیگار ایک ایسی لعنت تھی جس کے خلاف کشمیری عوام نے سب سے پہلے احتجاج کیا۔ اس وقت کی کشمیری زبان میں جو ضرب الامثال کہے گئے ہیں وہ آج بھی مروج ہیں۔ جیسے ''ٹل پلو وتھ ژلو'' (کپڑے اٹھاؤ اور یہاں سے بھاگ جائیں گے) ظاہری بات ہے یہ ضرب المثال گلگت بیگار کے لیے کہا گیا ہے۔ کیونکہ گلگت بیگار موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، اس لیے اُس سے بچنے کے لیے کشمیری لوگ پہاڑوں کی طرف رخ کرتے تھے۔ اسی طرح ایک اور مثال جس میں مزاحمت کے نقوش نظر آتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہے۔ ''پُو شُک نہِ تہِ ژولکھ تہ نہ (اگر تم دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو بھاگے کیوں نہیں)۔ مفلوک الحال کشمیریوں نے اس کے علاوہ 'لڑی شاہ' لوک گیت (Folk Songs) اور عورتوں کے گیتوں میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ ٹیکس یا مجاوزہ کشمیریوں کی ناگفتہ بہ حالت میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ اس کے خلاف 'لڑی شاہ' میں کشمیریوں نے احتجاج کیا۔ لیکن پچھلے کئی برسوں سے کشمیر جن خون آشام حالات سے گزر رہا ہے اس کا اثر یہاں کے شعراء اور ادباء پر بھی پڑا۔ جموں اور سرینگر کے نوجوانوں نے لاہور کے انقلاب، سیاست، زمیندار اور احسان جیسے اخباروں میں فرضی ناموں سے کشمیری مسلمانوں کی حالتِ زار پر مضامین لکھنا شروع کیے۔ اغلب ہے کہ اس سے وادی کشمیر میں مزاحمتی ادب کا تحریری طور پر آغاز ہوا۔ اس کے بعد یہاں جو بھی ادب تخلیق ہوا اس میں کہی نہ کہی مزاحمت اور احتجاج نظر آتا ہے۔ پھر چاہے وہ شاعری ہو یا ڈرامہ ناول ہو یا افسانہ۔ ناولوں میں شبنم قیوم کا ''یہ کس کا لہو، کون مرا''، نعیمہ مہجور کا ''دہشت زادی'' مزاحمتی ناولوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسی طرح مہجور اور عبدالاحد آزاد نے اہل کشمیر کی صدیوں کی پسماندگی کا احساس تیز کر دیا اور آزادی کے حصول کے لئے لوگوں کے دلوں میں عزم و یقین کی آگ بھڑکائی۔ فرید پربتی نے موجودہ حالات کی بے ساختہ منظر کشی اپنی دو نظموں ''نروان'' اور ''شہر آشوب'' میں کی ہے۔

کھو گئے گاڑھے دھویں میں شہر کے منظر تمام
اک پرندہ رہ گیا آہ و فغاں کرتا ہوا
رونق یہ میرے شہر کی اب لے گیا کون
ایک اک سڑک خموش ہے ایک اک مکان بند
اس درجہ گھٹ گیا ہے مکینوں میں اعتماد
کرتے ہیں شام ہونے سے پہلے دوکان بند

(فرید پربتی)

مخالف ساعتوں میں تجھ کو ہمدم کون رکھے گا
میری وادی تیرے زخموں پہ مرہم کون رکھے گا

(ترنم ریاض)

عصر حاضر میں کشمیر جس درد سے گزر رہا ہے اس کی بازگشت موجودہ دور کے اردو ادب میں موجود ہے۔ اس میں کشمیریوں کے د لولوں، خوابوں، حسرتوں اور دکھوں کی ترجمانی پُر درد انداز سے کی گئی ہے۔ مثلاً غلام محمد طاؤس کی ایک نظم سے چند شعر:

مرغزاروں، کوہساروں کی نہ پہلی شان ہے
ان بہاروں، آبشاروں میں نہ کوئی جان ہے
پھول کھلتے ہیں ابھی لیکن چمن ویران ہے
صحن گلشن جس کو سمجھتے ہو وہ ایک شمشان ہے
چاک ہے دل، ناک میں دم ہے جوان و پیر کا
اک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

نسرین نقاش کے چند اشعار:

فنا کے تیر ہوا کے پردوں میں رکھے ہیں
کہ ہم گھروں کی جگہ قبروں میں رکھے ہیں
اے زندگی نہ گزرنا ہماری گلیوں سے
ابھی ہمارے جنازے گھروں میں رکھے ہیں

(نسرین نقاش)

وادی کشمیر میں شاعری کے علاوہ افسانوں میں بھی مزاحمت کی روایت ملتی ہے۔ یہاں اردو افسانہ کی تاریخ یہی کوئی سوا سو سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ ابتدا میں یہاں روایتی انداز کے افسانے لکھے گئے لیکن پھر کشمیر کے عصری حالات نے یہاں کے افسانہ نگاروں کو اپنی زمین اور اپنے آس پاس کی زندگی کے حقائق اور مسائل کے درمیان سے افسانوں کے موضوعات چننے اور احتجاجی اور حقیقت پسندانہ رجحان اپنانے پر مجبور کر دیا۔ آزادی سے قبل کا یہ زمانہ شخصی راج کا زمانہ تھا۔ حکومت کے مظالم، استحصال اور غیر منصفانہ اقدامات سے ریاست کا ہر شخص تنگ آ چکا تھا۔ کشمیر کی افسانہ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ اس وقت ہوا جب ۱۹۴۷ء میں آزادی کی صبح طلوع ہوئی۔ جموں و کشمیر کو بھی شخصی حکومت سے نجات ملی۔ لیکن ملک کی تقسیم سے ادیبوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔ احباب و اقارب بچھڑ گئے۔ کئی فرقہ وارانہ فسادات میں مارے گئے۔ کشمیر پر قبائلیوں کا حملہ ہوا۔ سارا شیرازہ بکھر گیا۔ کئی خونچکاں داستانیں وجود میں آئیں۔ محمد مطہر امین ''کشمیر کے تیرہ اردو

افسانے'' کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

''ریاست میں افسانے کے ارتقاء کا دور سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا دور بھی تھا۔ ۱۹۴۷ میں شخصی نظام حکومت سے آزادی ملی اور کشمیر دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ دیگر اور نقصانات کے ساتھ ساتھ ادب بھی اس کی گرفت سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کئی افسانہ نگار ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور کئی ادیب معاش کی تلاش میں ریاست سے کوچ کر گئے۔۔۔۔اس سانحے سے کشمیر کی ادبی دنیا پر خاصا منفی اثر پڑا۔ ابھی صورت حال سے پوری طرح ابھر بھی نہ پائے تھے کہ ۱۹۸۹ء سے نئے مسائل نے اپنے قدم جما دیے اور اتحاد و اتفاق کی قدروں کو تاراج کرنے کی کوشش کی گئی۔ اردو کا ادبی حلقہ بھی اس سے بے حد متاثر ہوا۔ اس دور اہم افسانہ نگاروں کے یہاں وادی کی صورتِ حال اور سماج کا کرب تلخ انداز میں بیان ہوا ہے''۔ ۱۸

برصغیر کی تقسیم کے بعد ہی کشمیر بھی بٹ گیا۔ بہت سے افسانہ نگار پاکستان چلے گئے اور کچھ ملک کے دوسرے حصوں میں جا کر رہائش پذیر ہو گئے اور کئی افسانہ نگاروں کے تخلیقی ذہن پر جمود طاری رہا۔ قدرت اللہ شہاب، کوثر سیمابی، محبوبہ یاسمین، طالب گورگانی، کیف اسرائیلی، گلزار احمد فدا، عبدالحمید نظامی، شیخ منظور الٰہی، عبدالعزیز علائی اور عزیز پرکاش ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے جس کی وجہ سے کشمیر ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی ٹولی سے محروم ہو گیا۔ اسی طرح کنول نین پروانہ، کندن لال اور پریم ناتھ در وغیرہ ریاست سے باہر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں تلاش معاش کی خاطر بکھر گئے اور اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ نعیم بیگ اپنے مقالہ ''مزاحمتی ادب اور اس کی تشریحات'' میں رقم طراز ہیں:

''۔۔۔جب تقسیم ہند کے وقت کشمیر و دیگر سرحدی تنازعات کو حل طلب چھوڑ کر سلطنت برطانیہ یہاں سے نکل گئی۔ ان کے ابتدائی خیال میں ہندوستان کو چھوڑ کر چلے جانے کے بعد یہ منقسم ممالک بوجہ اپنے سرحدی تنازعات رہنے کے قابل نہ ہونگے۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے وہی صورت حال پیدا کی جو غسان مزاحمتی ادب کے حوالے سے سیاسی تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کشمیر کی خودارادیت اور بعد ازاں تقسیم کا تنازع درحقیقت ایک ایسی صورت حال تھی جس کی بنیاد پر ایک بڑے طبقے نے جلاوطن ہو کر پاکستان میں پناہ لی اور پھر یہاں سے مزاحمتی تحریک کا احیاء ہوا۔۔۔''۱۹

مشتاق حیدر لکھتے ہیں:

''اس کے ساتھ ساتھ (بٹوارے کے بعد) کچھ عرصہ تک یہاں کی ادبی فضا پر جمود کا عالم طاری رہا لیکن رفتہ رفتہ حالات سدھرے تو یہاں کے ادبی افق پر کچھ نئے چہرے ابھرے

جنہوں نے اردو افسانے کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔''۲۰

کشمیر سے باہر جتنے بھی ادیب اور سیاح یہاں وارد ہوئے انہوں نے صرف یہاں کے ایک ہی پہلو ''خوبصورتی'' کو بیان کیا ہے۔ یہاں کی عوام کئی مشکلات سے دوچار ہیں اس بات کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔اس نقطے یعنی کشمیری عوام کے دکھ درد، ظلم و جبر اور استحصال کو ابھارنے کے لئے یہاں کے ہی ادیبوں نے قلم اٹھایا اور ایسے افسانے رقم کئیں جو کشمیر کی سہی ترجمانی کرتے ہیں۔

اختر محی الدین اپنے تحقیقی مقالہ ''معاصر کشمیری افسانہ اور نیا شعور'' میں لکھتے ہیں:

''ہندوستانی ادب میں خوبصورت عورت کا تصور ''گوری'' ہے یعنی سفید جلد والی۔ ہندوستانی ادیب نے اس رنگ میں کشمیری عورت کو دیکھا اور بزم خود رومنٹک (romantic) افسانے لکھنا شروع کئے جن میں جھیل، پہاڑ، سیب، پھول اور پھیرن پہنے عورت ہمیشہ ہیرو (اور ہیرو افسانہ نگار اپنے آپ کو تصور کرتا تھا) کے انتظار میں رہتی تھی اور جوں ہی افسانہ نگار اس وادی کے اندر پاؤں رکھتا تو سیب جیسے گالوں والی عورت اس کو ٹیلے کے پیچھے ایزار بند کھولے ملتی تھی۔

کشمیر میں افسانہ نگاری کی شروعات دراصل ان ہی کرشن چندروں کے خلاف نفرت کے جذبے سے ہوئی۔ کشمیر کے افسانہ نگاروں نے دنیا کے سامنے یہاں کے سماج کی اصلی صورت پیش کرنا شروع کی اور یہاں کے افسانوں کو حقیقی روپ میں پیش کرنا شروع کیا اس میں مرحوم پریم ناتھ پردیسی، در اور سوم ناتھ زتشی کے افسانے قابل ذکر ہیں۔اگر چہ یہ افسانے ایک منفی تحریک کے زیر اثر لکھے گئے ہیں تاہم ان سب کا مثبت پہلو یہ ہے کہ کشمیری سماج میں مسخ شدہ یا faceless کردار کو پہلی بار dimensions عطا کی گئی۔موضوع کے اعتبار سے ان افسانوں میں ایک خصوصیت دیکھنے میں آتی ہے کہ اس میں کردار دنیاداری کی situations میں ڈال دیئے گئے ہیں تا کہ کرشن چندروں کو معلوم ہو جائے کہ کشمیری سماج پہاڑوں، مرغزاروں اور خوبصورت عورتوں سے ہی تشکیل نہیں پایا ہے بلکہ اس میں وہ تمام قباحتیں موجود ہیں جو ہندوستانی سماج میں پائی جاتی ہے۔ان افسانوں میں عشق و محبت کا عنصر غائب ہے اور یہ اس لئے کہ یہ افسانے احتجاج کے طور پر لکھے جا رہے تھے۔''۲۱

دراصل کشمیر کے لوگوں نے ہمیشہ سے ہی غلامی کی زندگی بسر کی ہے۔ یہاں کے بدلتے ہوئے حالات نے یہاں کے اردو افسانہ نگاروں کو اپنے افسانوں میں اہل کشمیر کی بے بسی، بے کسی، محرومیوں اور نارسائیوں کی تصویر کشی کا رجحان پیدا کیا۔ان افسانہ نگاروں میں

پریم ناتھ پردیسی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ پردیسی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز رومان سے کیا۔اوران ہی رومان پرور فضاؤں میں وہ اپنے افسانوں کا جالا بنتا رہا۔لیکن ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو اس تحریک نے ادیبوں اور شاعروں میں یہ احساس پیدا کیا کہ ادب کا سرچشمہ زندگی ہے اور اس لئے ادب کو زندگی اور اس کے بنیادی مسائل کا ترجمان ہونا چاہیے۔ان نئے رجحانات کا اثر برصغیر کے ادیبوں کے علاوہ کشمیر کے لکھنے والوں پر بھی پڑا۔ پردیسی کا اس تحریک سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔ان کے شعور نے کروٹ بدلی، وہ رومان کی دنیا سے نکل کر حقائق کے خارزار میں نکل آئے۔ڈاکٹر برج پریمی، پردیسی کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

> ''میں نے کبھی محض لکھنے کے لئے کہانی نہیں لکھی اور ہر بار محسوس کرنے کے بعد لکھی۔ میں نے خدا کے فضل سے بہت لکھا اور لکھتا ہوں۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیر کا ہر باشندہ بذات خود ایک افسانہ ہے، جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہ دی۔ یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ غلامی ہے، افلاس ہے، شخصی حکومت ہے۔۔۔''۲۲

پردیسی کو یہیں سے اپنے ہم وطنوں کی زندگی کے گوناگوں مسائل اور مصائب کا احساس ہوا اور ان کی کہانی رومانی فضا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں اتر آئی۔اس کے بعد پردیسی نے جتنے افسانے لکھے، ان میں کشمیر اور کشمیری عوام کی زندگی کو موضوع بنایا۔انہوں نے نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کی کہانیاں لکھیں اور جاگیردارانہ نظام کے مظالم، لوٹ کھسوٹ، رشوت ستانی، اقتصادی بدحالی، سماجی نابرابری کے المناک واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔اس طرح پردیسی نے اپنے ادب کو کشمیری کی روزمرہ زندگی اور ابھرتی ہوئی تحریکِ آزادی سے وابستہ کیا۔غلام محمد صادق پردیسی کے افسانوی مجموعے ''بہتے چراغ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''پردیسی ہماری ریاست کے بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔وہ کسی حقائق سے منہ نہیں موڑتے تھے جب ہماری قومی تحریک کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ عوام پر شخصی نظام کے مظالم کا شکنجہ بھی زیادہ زور سے کسا گیا تو پردیسی خاموش نہیں رہے۔انہوں نے ''جواری''، ''کتبے''، ''ان کوٹ''، کاغذ کی جھنڈیاں'' وغیرہ کہانیاں لکھیں۔۔۔ ان کہانیوں میں ان کے شعور کے ارتقاء کی جھلک بھی ملتی ہے۔ان کے کردار ہمارے حقیقی کردار ہیں''۔(بہتے چراغ، خراج عقیدت)

بہتے چراغ'' پردیسی کے افسانوں کا وہ مجموعہ ہے جس میں ان کے رومان سے حقائق کی طرف ذہنی وجذباتی موڑ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ان افسانوں میں مجبور ولاچار لوگوں کے دل کی دھڑکنیں اور اکھڑتی سانسیں ملتی ہیں جو جنتِ کشمیر میں صدیوں سے رہتے آئے ہیں۔ شخصی راج اور جاگیردارانہ نظام کی زورآوری اور استحصال پر پردیسی نے دل کو چھونے والی کہانیاں لکھی ہیں۔مثلاً ''کاری گر'' اور ''اگلے سال''۔اگلے سال میں ان جاگیرداروں اور زمین داروں کے استبداد کا ذکر ہے جس کے نتیجے میں غریب کسان اپنا خون پسینہ ایک کر دیتا ہے لیکن پیداوار کا بڑا حصہ زمین دار لیتا ہے۔اس کہانی میں بھی پردیسی نے اس کروٹ کو منظر عام پر لایا ہے جو کسانوں میں اس لوٹ

کھسوٹ کے خلاف ابھر رہی تھی۔

''رات کو ابراہیم سو نہ سکا، سوچتا رہا، کتنا ظالم ہے۔ بازار میں آلو سولہ روپے کے حساب سے بکتے ہیں اور مجھے چھ روپے کے حساب سے دینے ضروری ہیں۔ صرف اس لئے کہ بیوپاری نے مجھ سے فصل بونے سے پیشتر قیمت ادا کی۔ اس طرح سے وہ مجھے اپنی محنت کا اندازہ ہی لگانے نہیں دیتا۔ آخر اتنی محنت جو کرتا ہوں وہ کس لئے؟ اس لیے کہ اپنے خون سے بیوپاری کا پیٹ بھروں اور خود سوکھ کر کانٹا ہو جاؤں''۔ (اگلے سال، ص ۱۴۲)

استحصال، لوٹ کھسوٹ اور اس کے خلاف دلوں میں پکتا ہوا لاوا پردیسی کی دوسری کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔ جیسے'' سو غات''، ''اجالے اندھیرے'' وغیرہ۔ سرکار لوگوں کو خوراک بہم پہنچانے کے خاطر خواہ انتظام میں ناکام رہی تھی۔ چنانچہ اس کے خلاف زبردست احتجاج ہونے لگا اور فوڈ کمیٹیاں بن گئیں۔ پردیسی نے اسی زمانہ میں ''ان کوٹ'' کے عنوان سے ایک کہانی لکھی جو غذائی بحران کی عکاسی کرتی ہے۔ کشمیر کی بھوک سے بلکتی اور افلاس سے سسکتی زندگی کی تصویر ''ان کوٹ'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مہاراجہ ایک تقریب کا اہتمام کرتا ہے جس سے سارا کشمیر امڈ آتا ہے۔ لوگوں کا اتنا بڑا ہجوم دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سارا کشمیر بھوکا ہے۔

''ایک برہمن نے ان کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ساتھی برہمن سے کہا۔ ''کہاں بیٹھیں، سب مسلے ہی مسلے ہیں''۔ لیکن اس کی اس سوچ پر سب تھوکتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔ ایک برہمن نے مسلمان بھک منگے سے کہا۔ کیوں؟ میں تم سے پہلے آیا ہوں۔ ''ارے وہ بات نہیں۔ یہاں اپنی برادری ہے اس لیے''۔ دوسری قطار میں بیٹھے ہوئے ایک بھک منگے کے سر پر جیسے لاٹھی لگی، چمک کر بولا'' کیسی برادری؟ یہ میدان ہے۔ برادری کا اتنا ہی خیال تھا آئے ہی کیوں؟ تمام صفوں میں اس فلسفیانہ نقطہ نظر پر قہقہے بلند ہوئے۔ کیسی برادری''۔

(ان کوٹ، ص ۱۵۳)

پردیسی کے یہاں کشمیر کے جھرنوں، آبشاروں اور سبزہ زاروں کا ذکر بہت کم ہوا ہے۔ انہوں نے یہاں کی سسکتی زندگی کی تصویر کشی کی ہے، بھوک سے بلکتی ہوئی روحوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کی تقدیر پر افلاس اور بے بسی نے اپنی سیاہ چادر تان دی ہے۔ پردیسی کے افسانوں میں اس زمانے کے کشمیر کی سندرتا نظر آتی ہے اور وہ بدصورتیاں بھی، جن سے کشمیر اور اہل کشمیریوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے کشمیر کے تپتے ہوئے جہنم کدوں کی تصویر کشی بھی کی ہے، بھوک اور بے گاری کا احساس بھی دلایا ہے۔ منصور احمد منصور رقمطراز ہیں:

''پردیسی پورے فنکارانہ شعور اور خلوص کے ساتھ اہل کشمیر کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنے لگے۔ پردیسی نے کشمیری عوام کی زندگی میں جھانکا۔ ان کی دلی تمناؤں، امنگوں، مجبوریوں اور لاچاریوں کو محسوس کیا۔ ان کے رستے زخموں کو دیکھا اور اسے کہانی کا روپ دیا۔۔۔''۲۳

پردیسی اپنے ہم وطنوں کو خوشحال دیکھنا چاہتے تھے۔وہ صدیوں کی اس غلام قوم کو سربلند، آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔اسی لئے شخصی حکمرانی کے اس بدترین دور میں انہوں نے مختلف فرضی ناموں سے نوکر شاہی، استحصالی اور شخصی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا اور اپنی نفرت، غصے اور غم کا اظہار کیا۔ان کی یہ تحریریں ان کے اس ذہنی جہاد کی غمازی کرتی ہیں جو انہوں نے سیاسی، سماجی اور اقتصادی استحصال کے خلاف کیا۔یہاں کی غربت، بے روزگاری، ناخواندگی، ظلم و جبر، ان تمام چیزوں کو پردیسی نے اپنے افسانوں میں بیان کیا، اور کشمیر کی سچی اور صحیح زندگی اپنے قارئین کے سامنے پیش کی۔

''کوہالہ پل عبور کرتے ہی اسے سارا کشمیر کھڑے پانی سے بھری ہوئی جھیل کی طرح نظر آنے لگا، جس میں سڑاند پیدا ہوگئی ہو۔لیکن جس کی سطح پر نظر فریب کائی اُگ آئی ہو۔کون ہے جو اپنے نرم و نازک انگلیوں سے اس کائی کو ہٹا کر نیچے جھانکنے کی کوشش کرتا ہے اور اصلی کشمیر کو جا کر دیکھتا ہے۔جہاں حوروں اور دودھ کی نہروں کے بدلے مکروہ کیڑے اور غلاظت کے انبار میں بے کاری سے تنگ آئی جوانیاں ہیں۔افلاس کے سبب کراہتی ہوئی زندگی ہے۔''(سوغات)

برج پریمی اپنی تصنیف ''پریم ناتھ پردیسی: عہد، شخص اور فنکار'' میں رقم طراز ہیں:

''۔۔۔پردیسی نے اپنی بیشتر تحریروں میں ڈوگرہ شاہی اور مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف جس قدر احتجاج کیا، ان کے معاصرین میں بہت کم لوگوں نے کیا ہے۔۔۔ علائی، بالک رام باری، بابو اور دوسرے فرضی ناموں سے انہوں نے جس طرح ڈوگرہ شاہی کے جبر و استبداد کے خلاف احتجاج کیا، اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔''[۲۴]

ڈوگرہ شاہی کے آخری دور میں جب ظلم و استبداد کی آندھی زوروں سے چل رہی تھی تو پردیسی نے بالک رام باری کے فرضی نام سے لکھنا شروع کیا تھا اور شخصی راج، تاناشاہی اور مہاجنی نظام کے استحصال کو بڑی بے رحمی سے بے نقاب کیا۔صدیوں کی غلامی میں سڑے ہوئے عوام کو شخصی نظام، مذہبی تعصبات، توہمات، اقتصادی نابرابری اور رجعت پسندی کے خلاف اکساتا ہے۔کتبے، کاغذ کی جھنڈیاں، جواری، خون اور سکے، جہاں سرحد ملتی ہے، جھنجھنا، بہتے چراغ، کاریگر، دھول، اگلے سال، دیوتا کہاں ہیں، سیلز مین، یہ سب اسی قبیل کی کہانیاں ہیں۔

''بخدا کشمیر دوزخ ہے، دوزخ۔اب دیکھو گے دہلی کیا ہے۔۔۔۔؟(جنت و جہنم)

بیگار ایک ایسی لعنت ہیں جس نے اس دور میں کشمیری عوام کی روح کو مجروح کیا تھا۔بیگار کی وجہ سے نہ جانے کتنے کشمیریوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔اسی بیگار کے بارے میں پردیسی لکھتے ہیں:

''وہ ریل کے راستے سے جنت کشمیر میں داخل ہو گئے اور پیدل راستے سے درجن بھر کشمیری

مزدور پیٹھ پر بوجھ اٹھائے دوزخ سے نکل گئے۔''(جنت وجہنم)

پردیسی کے بیشتر افسانے خصوصاً ''جھنجھنا، سیلز مین، کاریگر، سنکرات، خون اور سکے'' استحصالی نظام کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔اس کے بعد پریم ناتھ درؔ نے بھی کئی مزاحمتی افسانے رقم کئے۔

پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری کا باضابطہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوتا ہے۔ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔'' کاغذ کا واسدیو'' اور ''نیلی آنکھیں''،اس کے علاوہ بھی ان کے کئی افسانے مختلف رسائل وجرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔درؔ نے اپنے افسانوں میں مختلف موضوعات کو پیش کیا ہے۔کہیں فساد کی ہولناکی کا ذکر کرتے ہیں تو کہیں انسانی استحصال، ظلم، بربریت اور تشدد کو اپنا موضوع بنایا ہے۔درؔ کے افسانوں میں ایک بنیادی قصہ تو ہوتا ہی ہے لیکن یہ بنیادی قصہ بہت سارے حالات وواقعات کو جنم دیتے ہیں جو قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔درؔ نے بھی کئی قابل قدر مزاحمتی واحتجاجی افسانے تحریر کیے ہیں۔''آخ تھو'' ان کا ایک منفرد افسانہ ہے۔مذکورہ افسانے میں در نے انسانی زندگی کے استحصال اور روحِ انسانی کی پامالی کی داستان کو پر درد انداز میں بیان کیا ہے کہ کس طرح انسان دوسرے انسانوں کا گوشت مزے لے لے کر کھاتا ہے۔ایک کی زندگی دوسرے کا نوالہ کیسے بنتی ہے۔مصلحت پسندی کے تحت ایک ادیب اشاروں، کنایوں، استعاروں کا استعمال کر کے ظلم اور تشدد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔پریم ناتھ در نے بھی درویش اور مچھلی کو بطورِ علامت استعمال کیا ہے۔

''اس گوشت کا نام بڑی نعمت ہے، روز بکتا ہے۔لیکن آج کا گوشت اچھا جوان ہے۔یہ گوشت کبھی کبھی ملتا ہے کیونکہ جوانوں کا شکار ذرا مشکل ہوتا ہے۔بوڑھے، بچے اور مادہ تو روز ہی بکتے ہیں۔۔۔اور سنو تم خدا کا نام کھڑے ہو کر لیتے ہو یا لیٹ کے''۔(آخ تھو، ص۲۵)

''چڑھاوا'' نام کی کہانی دراصل کشمیریوں کی اس بے بسی اور بے کسی کی داستان ہے جب وہ غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ساتھ ہی جب ان کو بیگار کے لئے لیا جاتا تھا۔بیگار کے وقت کشمیریوں کو کن کن مصائب وآلام سے گزرنا پڑتا تھا اس کا ذکر تاریخ میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔آج بھی جب ہم تاریخ کے اوراق الٹتے ہیں تو مظلوم کشمیریوں کی آہیں اور سسکیاں ہر طرف بکھری پڑی نظر آتی ہیں:

''اور قلیوں میں سے ایک تو یہ رونا رو رہا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی نسوار کے لئے فرنگیوں سے ایک خوب صورت سی خالی شیشی مانگ لائے گا۔اب کو فرنگی اسے موت کی طرف گھسیٹتے ہوئے لیے جا رہے تھے۔بڑھیا شیشی کہاں سے لیتی؟ نسوار ہی اب اسے کون دیتا؟ دوسرا جو فرنگیوں کے دسترخوان کو جھاڑتا تھا، سوچ رہا تھا کہ ولایتی کلچوں کے چورے سے اس نے یوں ہی جیبیں بھر رکھی تھیں۔بھیجے کہاں؟ اب موت اس اس کا انتظار کر رہی تھی''۔(چڑھاوا، ص۱۳۸)

منصور احمد منصور لکھتے ہیں:

''درؔ نے کشمیریوں کے درد وداغ اور ان کی مجبور ومقہور زندگی کو اپنے فن میں سمو دیا۔ان کی

کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں pathos بہت گہرا ہے اور ہر جگہ ایک شدید المیہ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ المیہ انسانی قدروں کا بھی ہے اور معاشرے کی زبوں حالی کا المیہ بھی۔ کشمیر کی المناکی درکی کہانیوں میں پوری طرح آشکار ہوتی ہے۔''۲۵

مشتاق حیدر اپنے مقالہ ''کشمیر میں اردو افسانہ'' میں رقم طراز ہیں:

''۔۔۔ پریم ناتھ پردیسی، قدرت اللہ شہاب، پریم ناتھ در، مہندر ناتھ کے افسانے، فن اور تجربے کے لحاظ سے بڑی حد تک ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے فن پاروں میں زیادہ تر کشمیر کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ اسی لیے ان سب نے اپنے افسانوں میں ڈوگرہ شاہی کے مظالم، سیاسی وسماجی بے راہروی، معاشی واقتصادی بدحالی، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام، اس دور کی جہالت، پراگندگی، افلاس، ظلم وستم اور ظلم و مظلوم کی مختلف عنوانات وموضوعات کا سہارا لے کر نقاب کشائی کی ہے۔''۲۶

اسی طرح پشکر ناتھ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۳ء میں کیا، ان کا پہلا افسانہ ''کہانی پھر ادھوری رہی'' ملک کے نامور جریدے ''بیسویں صدی'' دہلی میں شائع ہوئی۔ ان کے جو افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں ''اندھیرے اجالے'' ''ڈل کے باسی''، ''عشق کا چاند اندھیرا'' اور ''کانچ کی دنیا'' قابلِ ذکر ہیں۔ پشکر ناتھ نے بھی پہلے پہل رومانوی کہانیاں لکھیں لیکن پھر رومانوں سے نکل کر انہوں نے کشمیر کی زندگی کے کرب کو اپنے افسانوں میں ڈھال دیا۔ ان کی کہانیوں میں اس کا اپنا غم نہیں، اپنے آنسوں نہیں ہیں بلکہ کشمیر کے غم زدہ حسن، لوگوں کے سسکتے ارمان اور کل انسانیت کا درد ہے۔

بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

''پشکر ناتھ کے افسانوں کا محرک کشمیر کی زندگی اور اس کی حسین فضائیں ہیں لیکن فطرت کے ان حسین مناظر کے درمیان عوام کی غربت اور اس کا افلاس ایک تضاد ہے، جس کے نقوش وہ بڑی جانکاری کے ساتھ ابھارتے ہیں''۔۲۷

پشکر ناتھ کے افسانوں میں وہ کشمیر نہیں ملتا ہے جس کے بارے میں شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اکثر ذکر کیا ہے۔ ''عزت کا سوال، کنگ فشر، ایک بندر ایک انسان، ایک دونی زرد پتے، جرم کا اقبال، بھگوان شنکر کے نام ایک خط'' وغیرہ میں کشمیر کی حقیقی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ پشکر ناتھ کے افسانوں میں وہ کشمیر نظر آتا ہے جس میں عام لوگوں کی افلاس، ناداری، محرومی اور مجبوری کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

کشمیر کے افسانوی افق پر بہت سے افسانہ نگار ایسے ہیں جنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو زبان میں لکھنے سے کیا لیکن پھر بعد میں کشمیری کی طرف مائل ہو گئے۔ ان میں علی محمد لون، اختر محی الدین اور غلام رسول سنتوش کے نام قابل ذکر ہیں۔ اختر محی الدین نے

بھی کئی افسانے لکھے ہیں۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں اردو کہانی کو ہی اپنا ہم سفر بنایا۔۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان انہوں نے کئی اردو افسانے لکھے ان میں ''بھاؤ گرر ہے ہیں،اور رات مرگئی، پیوند، گدھ اور پونڈ رچ'' قابل ذکر ہیں۔یہ افسانے اس زمانے کے معروف جریدے ''کونگ پوش'' میں شائع ہوئے ہیں۔ان کے کئی افسانوں میں کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کی عکاسی کی گئی ہے۔ان کہانیوں میں انہوں نے حقوق انسانی کی پامالی کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔اختر محی الدین پدم شری انعام یافتہ بھی تھے لیکن جب محمد مقبول بٹ کو پھانسی کی سزا دی گئی تو انہوں نے بطور احتجاج پدم شری کا اعزاز واپس لوٹا دیا۔

''اور رات مرگئی'' اختر محی الدین کا ایک علامتی افسانہ ہے۔جس میں انہوں نے اشاروں کنایوں کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔وہ ''الو'' کو بطور ظالم اور ''بلبل'' کو مظلوم کے طور پر پیش کرتے ہیں۔جیسا کہ پہلے ہی کہا گیا ہے کہ مزاحمت میں زیادہ تر اشاروں کنایوں سے کام لیا جاتا تھا،اس لئے اختر محی الدین نے بھی ظلم کی منظر کشی کرنے کے لئے ایسی ہی زبان کا استعمال کیا ہے۔مذکورہ افسانے کے آغاز ہی میں افسانہ نگار نے ایک ایسی اندھیری رات کا تذکرہ کیا ہے جس کا کالا سیاہ اندھیرا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا جارہا ہے۔اس گھٹاٹوپ اندھیرے نے ہر ایک چیز کو اپنی سیاہ چادر میں لپیٹ لیا ہے:

> ''جس طرح چراغ کی آخری ہچکی زیادہ پرنور ہوتی ہے،بالکل اُسی طرح اس دم توڑتی ہوئی رات کا اندھیرا زیادہ گہرا اور گھناونا ہوگیا تھا اور یہ گہری اور گھناونی تاریکی باغ پر اس طرح مسلط تھی جس طرح کفن اوڑھی ہوئی لاش پر تابوت کے اندھیرے مسلط ہوتے ہیں۔پودوں کی ڈالیاں مردہ جسموں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں۔کلیوں کا سیاہ چہرہ منحوس اور مضموم نظر آتا تھا۔''(اور رات مرگئی،ص ۷۶)

ظالم اُلو اس اندھیرے کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔جہاں کہیں بھی کوئی کمزور شئے نظر آتی اس کو دبوچ لیتے تھے۔مظلوم چڑیا ،بلبل ڈرے ہوئے، سہمے ہوئے اپنے گھونسلوں پر پہرہ تو دیتے تھے لیکن ظالموں کے ظلم سے اپنے بچوں کی حفاظت نہیں کر پاتے تھے۔ظلم کی اس اندھیری رات میں نہتے چڑیوں اور بلبلوں کے بچوں پر جب یہ ظالم شب خون مارتے تھے تو ان کے بے بس ماں باپ اگر احتجاج کرتے تو انہیں بھی سزا دی جاتی تھی:

> ''۔۔۔اگر کہیں کوئی اُلو کسی چڑیا،بلبل یا کوئل کے گھونسلے میں سے ایک دو بچے اٹھانے کے لیے درخت کی ٹہنی پر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو اس کے بوجھ کے نیچے ٹہنی چیخ کر ٹوٹ جاتی اور گھونسلے کے ساتھ زمین پر آتی تب شور اٹھتا بچوں کی چیں چیں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔اور ان کے گستاخ ماں باپ جو بظاہر بڑے نحیف،کمزور اور لاچار نظر آتے تھے،غل مچاتے اور باغ میں کہرام مچاتے اور بچارے الو کو مجبور کرتے کہ وہ اپنی نیت بدلے اور ایک دو بچوں کے بجائے سب خاندان کو سزا دے۔۔۔''
>
> (اور رات مرگئی،ص ۷۶)

اُلو سیاہ رات کے اندھیرے میں بلبلوں، چڑیوں اور کوئیلوں کو دبوچ لیتے ہیں،ان کو گھر سے بے گھر کرتے ہیں اور پھر ان مظلوموں

کو دبانے کے لئے ،ان پر بے تحاشا ظلم و جبر اور تشدد کرنے کے لیے ان ظالموں کو کھوکھلی نظام حکومت سے بہادری کے تمغے ملتے ہیں۔:

"۔۔۔بہت سے اُلو پرندوں کی اس سمع خراش شور کو سُن کر جائے وقوع پر جمع ہو جاتے اور تب پرندوں پر تابڑ توڑ حملے کرتے اور زیادہ سے زیادہ پرندوں اور ان کے بچوں کو مارنے کے صلے میں اپنی حکومت سے بہادری کے تمغے پاتے جو عمر بھر تک ان کے سینوں پر لٹکتے رہتے۔اُلوؤں کی حکومت ایسے ہی جانبازوں کے دم قدم سے آباد تھی اور حکومت ان جانبازوں اور وفاداروں کی خوشنودی کے لئے گستاخ چڑیوں، بلبلوں اور کوئیلوں اور ان کے بدتمیز بچوں پر حملے کرنے اور ان کو ختم کرنے کی اجازت دیتی اور یہ جانباز حملے کرتے۔ گستاخوں کو سزا دیتے اور الوؤں کی حکومت اس خوف و ہراس اور دہشتنا کی کے طفیل زندہ رہتی۔"(اور رات مرگئی، ۶۷، ۶۸)

اُلو اکیلے اپنے دم قدم پر اتنی دہشت نہیں پھیلاتے تھے بلکہ چمگادڑیں بھی اس ظلم و جبر میں ان کی برابر کی شریک تھیں۔وہ بھی اس کالی سیاہ رات میں بلبلوں، چڑیوں اور کوئیلوں پر ڈر اور خوف طاری کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے تھے۔یہ منحوس چمگادڑیں ان اُلوؤں کے لیے جاسوسوں کا کام کرتے تھے۔باغ کے کسی بھی کونے میں جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ اُلوؤں کو خبر دیتے تھے:

"۔۔۔تاریکی شدید طور پر گہری ہو رہی تھی اور الوؤں کی حکومت پورے شباب پر تھی۔ چمگادڑیں اپنے پر پھیلائے ہوئے جاسوسوں کی طرح باغ کے اوپر منڈلا رہی تھیں اور انہیں جہاں کہیں بھی باغ کے کسی بھی کونے میں کوئی سہما سکڑا ہوا پرندہ اپنی چونچ پروں میں دبائے نظر آتا تو وہ ان کے قریب آ کر اس قدر زور سے چیخ مارتے کہ بے چارہ پرندہ ہڑبڑا کر چوں چوں کرنے لگتا۔اُلو اپنے کارندوں کے کارناموں پر مسکراتے اور ان کی بڑی بڑی آنکھیں اندھیرے کا جگر چیرتی ہوئی پرندے کی بے بسی پر خوشی سے ناچتی ہوئی نظر آتیں۔۔۔"(اور رات مرگئی، ص ۶۸)

اختر محی الدین کا ایک اور افسانوی مجموعہ سیون ون نائن سیون ون کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔جو کشمیری زبان میں ہے مذکورہ افسانوی مجموعے میں بھی کئی مزاحمتی افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں میں بھی کشمیری عوام کی دکھ بھری داستان پیش کی گئی ہے۔ظلم اور بربریت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

"آتنگ وادی" سے ایک اقتباس:

"جس گلی سے سارہ کا گزر ہوا وہاں سے ایک گشتی پارٹی آ رہی تھی۔آٹھ سالہ پرنس کی نظریں جوں ہی سپاہی پر پڑی تو وہ رونے لگا۔سارہ نے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن بے سود، وہ روتا رہا اور جانے کس بات پر ضد کرتا رہا۔فوجی آفیسر یہ سوچ کر رک

گیا کہ بچہ انہیں دیکھ کر ڈر گیا۔قریب آ کر بولا:

''ڈرو نہیں بیٹا۔۔۔ڈرو نہیں!''

''یہ ڈرتا نہیں ہے''۔آپا نے کہا۔

''تو پھر کیوں رو رہا ہے''

''بولتا ہے گن دے دو۔جب کسی فوجی کو دیکھتا ہے،بولتا ہے گن دے دو''

''آتنگ وادی سالا۔۔۔''یہ کہتے ہوئے آفیسر آگے چل دیا۔(آتنگ وادی،اختر محی الدین)

مزاحمتی افسانوں کی یہ روایت اسی طرح آگے بڑھتی رہی۔لیکن ۱۹۹۰ء کے بعد جس طرح کشمیر کے حالات نے کروٹ بدلی اس سے مزاحمتی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

حوالے

۱:شمیم احمد،محمد مطہر امین،کشمیر کے تیرہ اردو افسانے،(دہلی:ایم۔آر۔پبلی کیشنز،۲۰۱۶)ص۹،۱۰

۲:نعیم بیگ،مزاحمتی ادب اور اس کی تشریحات،آن لائن دیدبان،مارچ ۲۳،۲۰۱۸(شمارہ ۷)4\12

۳:مشتاق حیدر،کشمیر میں اردو افسانہ،شیرازہ جلد۵۲،(سرینگر:اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز،شمارہ ۱۱۔۱۲)ص۶۴

۴:اختر محی الدین،''معاصر کشمیری افسانہ اور نیا شعور''ہمارا ادب(شیرازہ انتخاب نمبر ۱۹۷۹۔۱۹۷۸)ص۱۴۶۔۱۴۵

۵:برج پریمی،پریم ناتھ پردیسی:عہد،شخص اور فنکار،ص۶۴

۶:منصور احمد منصور،پریم ناتھ در اور جدید افسانہ،(دہلی:انشا پبلشنگ ہاؤس ترکمان گیٹ،۲۰۰۶)ص۹۲

۷:برج پریمی،پریم ناتھ پردیسی:عہد شخص اور فنکار،ص۶۶

۸:منصور احمد منصور،پریم ناتھ در اور جدید افسانہ،(دہلی:انشا پبلشنگ ہاؤس ترکمان گیٹ،۲۰۰۶)ص۱۴۵

۹:مشتاق حیدر،کشمیر میں اردو افسانہ،شیرازہ جلد۵۲،(سرینگر:اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز،شمارہ ۱۱۔۱۲)ص۶۳

۱۰:عبدالقادر سروری،کشمیر میں اردو،جلد سوم،(سرینگر:جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز،۱۹۸۲)ص۱۸۸